

عکسِ دیوار پہ تصویر

شہناز مزمّل

بسم الله الرحمن الرحيم

ضابطہ

عنوان ـــــ عکسِ دیوار پہ تصویر

مصنّف ـــــ ڈاکٹر شہناز مزمّل

سرورق ـــــ حماد علی

ناشر ـــــ ذیشان بک پیلس

پرنٹر ـــــ اکیڈیمک پریس۔ اُردو بازار لاہور

طبع اول ـــــ اکتوبر ۱۹۹۱ء

تعداد ـــــ ۱۱۰۰

قیمت ـــــ ۹۲ روپے

خوشنویس ـــــ رزّاقی

تزئین و نگرانِ طباعت ـــــ سرفراز احمد۔ خرم آرٹس، کمرہ نمبر ۳۰

العزیزیہ مارکیٹ اردو بازار۔ لاہور

انتساب

طویل رفاقتوں

کے نام!

BIO DATA

نام: ڈاکٹر شہناز مزمل، مسز

تعلیمی قابلیت: ایم۔ اے لائبریری سائنس، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۸۴ء

ڈی۔ ایچ۔ ایم۔ ایس، پنجاب ۱۹۹۱ء

بانی چیف لائبریرین گورنمنٹ ماڈل ٹاؤن لائبریری لاہور

اجراء ادبی سرگرمیاں برائے فروغِ مطالعہ

تصنیف و تالیف۔ لیکچرز۔

ملتان ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہونے والی پہلی خاتون کی آواز

مختصر کورس: فرانسیسی زبان ۱۹۸۹ء

کمپیوٹر ۱۹۹۰ء

انتظامی امور ۱۹۹۰ء

ممبرشپ: پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن ؛ کونسلر

انجمن طلباء قدیم ؛ جوائنٹ سیکرٹری

انٹرنیشنل ویمن ایسوسی ایشن ؛ ممبر

قادری ویلفیئر سنٹر ؛ ڈائریکٹر

حلقۂ تجدیدِ سخن ماڈل ٹاؤن ؛ صدر

اکبری ویلفیئر ایسوسی ایشن، لاہور برانچ ؛ انچارج

ایوارڈز: ایوارڈ برائے حسنِ کارکردگی۔ ۱۰ جون ۱۹۸۹ء

" " " ۱۰ جون ۹۱۔۱۹۹۰ء

ادبی ایوارڈ گورنر پنجاب ۱۲ ستمبر ۱۹۹۱ء

ترتیب

غزلیں

نظمیں

ایک دانشور مجاہدہ ـــ شہناز مزمّل

مجھے بہادروں کی تلواروں کی قسم کہ شہناز مزمّل کے ہاتھ میں وہی قلم ہے جس کی سوگند ربِّ ذوالجلال نے کھائی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

"قسم ہے قلم کی اور قلم سے لکھے ہوئے کی"

یہی قلم نیکیوں کی پُر سعادت صبحوں کا افتتاح بھی ہو سکتا ہے اور تیرہ وتار گناہوں کی منجمد رات بھی، جو سینکڑوں دوسری راتوں سے جوڑ دی گئی ہے۔

خیر کے لفظ کا اجر ثمر آور پیڑوں کی طرح ہوتا ہے جو صدیوں تک نسلِ انسانی کو اپنی چھاؤں اور اپنے ثمر سے سرفراز کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح شر کی خاطر لکھی جانے والی تحریر بھی جب تک بدی کی قوتوں کی ترویج کرتی رہتی ہے اس کے خالق کی لوحِ تقدیر لازوال گناہوں کے دھبوں سے داغدار ہوتی رہتی ہے۔

شہناز مزمّل اس حوالے سے ایک خوش بخت شاعرہ ہے کہ اس کے لفظ مشرفِ

اقدار کے پاسدار ہیں۔ اس کی فکر پاکیزگی اور طہارت کی امین ہے۔ اس نے دین اور وطن کی محبت کو تخلیقی عمل میں بدل دیا ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور خطۂ عشقِ محمدؐ یعنی پاکستان سے گہری وابستگی نے اس کی شعری فضا کو تقدس مآب نغموں سے معمور کر دیا ہے۔ یوں اردو ادب دانش گاہِ محمدؐ سے تربیت حاصل کر کے ادبِ عالیہ کی آبرو بن رہا ہے۔

شہناز مزمل نے نہ صرف عورت کے وقار اور شرم و حیا کا بھرم رکھا ہے بلکہ عظیم مقاصد کی طرف پیش رفت بھی کی ہے۔ عورت کو خواب گاہ اور باورچی خانے سے نکال کر یہ احساس دلایا ہے کہ وہ ایک بڑی کائنات میں مقیم ہے اور اسے تسخیر کر سکتی ہے لیکن اس کی تسخیر کا رستہ فاطمۃ الزہراؓ کا رستہ ہے۔ رابعہ بصریؒ کا رستہ ہے۔ وہ نہیں چاہتی کہ عورت ملی غیرت اور دینی حمیت کو چھوڑ کر صباح کی پری بن جائے۔

اس نے نہ صرف شاعری میں عورت کو عالمگیر غلبۂ اسلام، انسانیت اور مساوات کی سربلندی، شعورِ ذات، شخصیت اور کردار کی تعمیر اور تصوّف جیسے صوفیانہ اور دانشورانہ مسائل پر سوچنے کی دعوت دی ہے۔ وہ تو کہتی ہے کہ سنگینیٔ حالات کا اب یہ تقاضا ہے کہ ہتھیلیوں پر سروں کو سجا کر سرِ میدان نکل آئیں تاکہ ظلمتِ شب کا دامن چاک کر کے ایمان کا آفتاب طلوع کیا جا سکے۔ وہ عورت کو ایک دانشور مجاہدہ کے روپ سروپ میں دیکھنا چاہتی ہے اور ایسی شاعرہ کی موجودہ ادب میں کوئی مثال نہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہمارے تنقید نگاروں نے بھی اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ انہیں تو ایسی شاعرات چاہییں جو مغرب کی تقلید میں ان کے ساتھ قدم ملا کر چل سکیں اور اس میں ان کا کوئی تصور بھی نہیں۔ آخر

ان کی تمام تنقید مغربی ادب سے برآمد شدہ ہے

شہناز مزمل ایک باطنی تبدیلی کی خواہش مند شاعرہ ہے۔ وہ زمین کی پستیوں سے تنگ آ چکی ہے اس لیے اپنے رابطے لولاک کی وسعتوں سے رکھنا چاہتی ہے۔ خالقِ کائنات کی بارگاہ میں اپنے لیے جگہ مانگتی ہے۔ اسے علم ہے کہ اگر اس بارگاہ میں اسے امان مل گئی تو پھر وہ اپنے آپ سے آشنا ہو جائے گی۔ اس پر تمام جہانوں کے راز فاش ہو جائیں گے پھر اسے یقینِ کامل ہو جائے گا کہ میں ہی عالمِ لاہوت کی خوش بخت سحر ہوں۔ میں ہی حرکتِ افلاک ہوں اور میں ہی ثابت و سیار۔ وہ جذب و مستی کی بقا سے شناسا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ عشق کی فضا کوئی نہیں۔ وہ فلسفۂ جذب و فنا کے عمل سے واقف ہے۔ وہ جانتی ہے کہ جذب کے بغیر کوئی تصویر مکمل نہیں ہو سکتی اور شاید اسی کیفیت میں اس نے اپنے آپ کو بھلا رکھا ہے —— اور شاید اسی لیے اس نے اپنے پہلے مجموعہ کلام کا نام بھی "جذب و حروف" رکھا ہے اور وہ اپنے تمام گم شدہ جذب و حروف کی تلاش میں تخلیق کے دروازوں پر مسلسل دستک دیتی چلی آ رہی ہے

اردو ادب میں کوئی بھی "بڑی" شاعرہ موجود نہیں، بلکہ یونانی زبان کی شاعرہ سیفو کے سوا دنیا کی کسی زبان میں کوئی عورت بڑی شاعری نہیں کر سکی۔ اس کی بنیادی وجہ تو وہی معاشرتی جبر ہے جس نے دنیا کے ہر خطے میں عورت کا استحصال کیا۔ بیسویں صدی عورت کی آزادی کی صدی ہے۔ اب توقع کی جا سکتی تھی کہ انگریزی زبان میں کوئی بڑی شاعرہ نمودار ہو مگر یورپ نے بھی آزادیٔ نسواں کے نام پر عورت کو جنس کی دکان بنا دیا

ہے، اس لیے یقین سے کوئی بات نہیں کہی جا سکتی۔

عرب، ایران اور برِصغیر میں عورت ابھی قدیم رسومات اور رواجوں میں قید ہے اس لیے اگر کوئی شاعرہ ذرا سی بھی نمایاں ہوتی ہے تو یہ بہت بڑی بات ہے۔ شہناز مزمل اس حوالے سے بھی قابلِ تحسین ہے کہ ایسے پابند معاشرہ میں بھی اپنی ذات کا اظہار کر رہی ہے، ورنہ مشرق کی معاشرت تو عورت کو شاعری کا کجا، ہنسنے اور رونے کا حق بھی نہیں دیتی۔ اگر کسی آنکھ میں آنسو مچلنے ہی لگیں تو ہاتھ وہ آنکھ نکالنے کے لیے بڑھنے لگتے ہیں۔ اگر کسی لب پر مسکراہٹ کے پھول کھل اٹھیں تو لوگ انہیں کاٹنے پر تل جاتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں جو شاعرہ بھی سامنے آئی ایک جھنجھلاہٹ کا شکار محسوس ہوئی اور زلف و گیسو کے علاوہ ان موضوعات سے دانستہ گریز پا رہی جو مردوں کے پسندیدہ تھے مگر شہناز مزمل نے اپنے عہد کی شاعرات کے برعکس انہی موضوعات پر ہاتھ ڈالا جنہیں مردوں نے اپنی جاگیر سمجھ رکھا ہے۔ تصوّف اور وطنیّت جیسے معاملات پر کھل کر اظہارِ خیال کیا لیکن کہیں بھی یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ یہ کسی خاتون کی شاعری نہیں بلکہ شہناز مزمل کی شخصیت تو اپنی شاعری میں جاگتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

دراصل شاعری کی تخلیق میں زیادہ عمل دخل تربیت اور مطالعے کا ہوتا ہے۔ آدمی جیسا مطالعہ کرتا ہے، جس طرح کے لوگوں سے تربیت حاصل کرتا ہے، وہ اس کے تخلیقی عمل پر بہت زیادہ اثرات مرتب کرتے ہیں۔ شہناز مزمل کی خوش قسمتی ہے کہ اس کی تربیت گاہ کوئی نیکیوں سے بھرا ہوا آنگن بنا جس میں پاکیزگی ہی پاکیزگی تھی اور منوّر باطنوں والے لوگ

رہتے تھے۔ دوسرے اس کا مطالعہ بھی اس طرح کا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اقبال جیسا لاہوتی فضا رکھنے والا شاعر اس کے دل کے قریب آباد ہے۔

میری ان باتوں کا مفہوم قطعاً یہ نہیں کہ اس نے ان موضوعات کو چھیڑا ہی نہیں جو اس عہد سے وابستگی رکھتے ہیں۔ وہ روایت کے درخت کی چھاؤں میں بیٹھ نہیں گئی بلکہ اس نے تو اس کی چھاؤں کو اپنا ہمسفر بنا لیا ہے۔ مجھے نئی راہوں پہ روایت کا شجرِ سایہ دار اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور لمحۂ موجود کے سلگتے ہوئے موضوع کینوس پر اس کے باطنی رنگوں میں گھل کر ایک نئی تصویر بناتے ہیں۔ ایک ایسی تصویر، جس میں ہمارا ماضی بھی ہے، حال بھی اور مستقبل بھی۔

شہناز مزمل نے اپنی بات کو استعاروں اور تشبیہوں کے غلافوں میں لپیٹ کر پیش نہیں کیا۔ وہ جانتی ہے کہ آج کے تیز رفتار دور میں کسی کے پاس فرصت کی اتنی ساعتیں نہیں کہ وہ آپ کے شعر پہ گھنٹوں سوچ سکے۔ اس کی تو کوشش ہوتی ہے کہ خیال لفظوں سے اُبل رہا ہو۔ اپنی اس کوشش میں وہ مکمل طور پہ کامیاب دکھائی دیتی ہے۔

منصور آفاق

اذنِ کلام

اپنے جذب کو حروف دینے کے بعد جراْتِ اظہار کا سلیقہ پایا اور آج عکسِ دیوار پہ تصویر بناتے حیران سی کھڑی ہوں۔ خیالات کے سمندر پر لفظوں کی دہلیز سجی ہے!! کونسا دُرِ نایاب چُنوں جو اپنے قارئین کی نذر کر سکوں، کچھ سمجھ نہیں پا رہی۔ جو کچھ میرے پاس تھا وہ پیش کر چکی اور مزید جو کچھ ہو گا وہ بھی آپ ہی کی عطا ہو گی اور آپ کی ہی امانت!

میں کچھ فطرتاً جلد باز واقع ہوئی ہوں۔ اس بار سوچا تھا کہ کوئی بھی تخلیق جلد بازی کی نظر نہیں کروں گی مگر ہم سب جس کے حکم کے تابع ہیں، اس نے میرے حروف کو صدا بخشی اور درِ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) سے ندا آئی تو جانا کہ شکر گزاری کا اس سے بہتر موقع اور کیا ہو گا اور ہر کام خود بخود غیر محسوس طریقے سے قدرت انجام

دیتی رہی۔

جذب و حروف اور جراُتِ اظہار کے پہلے ایڈیشن ختم ہو چکے ہیں۔ کچھ احباب کا اصرار تھا کہ ان کو دوبارہ پرنٹ کروایا جائے جو فی الحال ممکن نہ تھا۔ ان دونوں مجموعوں میں سے چیدہ چیدہ چیزیں اس میں شامل کر دی ہیں۔

ہر راستہ "کُن" کے ذریعے بنا ہوتا ہے اور یہ ہمارا ایمان ہے کہ ہمارے لیے فیصلے لوحِ محفوظ پر ازل سے رقم ہیں اور قدرت ان کے لیے راستے خود بنایا کرتی ہے، توکّل اور عزمِ صمیم شرط ہے۔

فیصل حنیف ___ آج کی نوجوان نسل کا نمائندہ شاعر (جو یقیناً آنے والے کل کے اساتذہ میں شامل ہوگا) درازیِ عمر و اقبال کی دعاؤں کے ساتھ، میں اس کی بے حد ممنونِ احسان ہوں کہ اس نے ہر مرحلے پر بھرپور معاونت کی۔

اس کے علاوہ میں حماد علی، محمود سرور، سرفراز احمد صاحب اور انوار صاحب کی بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے دستِ تعاون دراز فرمایا۔

آخر میں ___

مَیں اپنی والدہ صاحبہ، اپنے شوہر سلطان احمد، اپنے بچوں مینا

نعما اور فاروق کے لیے بھی دعاگو ہوں جن کے وقت میں سے بہت سے لمحے مستعار لے کر میں عکسِ دیوار پہ تصویر بنا سکی۔ اب فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے کہ یہ تصویر مری تعبیر کے خواب کا ادھورا عکس ہے یا پورا، تاکہ میرا خواب جو ادھورا ہے اس کو بھی پورا کیا جا سکے۔ آپ کی آراء کی منتظر رہوں گی۔

بے شک میں ان اعزازات کے قابل تو نہیں ہوں جن کے قابل آپ نے مجھے سمجھا۔

شہناز مزمل

۱۲۵- ایف

ماڈل ٹاؤن لاہور

یکم اکتوبر ۱۹۹۱ء

کرم یہ رحمتِ ربّ الانام کر دینا
عطائے جلوۂ دارُالسّلام کر دینا

پیامِ اذنِ حضوری مجھے ملے بصدم
زباں پہ جاری محمدؐ کا نام کر دینا

نہ لوں میں دولتِ کونین آپؐ کے بدلے
توؐ روزِ حشر، شفاعت امام کر دینا

ترس رہی ہوں مَیں انوارِ صبح کوکب سے
ورُودِ نورِ سحر میرے نام کر دینا

دیارِ یثرب و بطحا میں کر سکوں سجدے
نگاہِ لطف سے یہ انتظام کر دینا

طوافِ روضۂ اقدسؐ ہو میری قسمت میں
تو ایک صبح کی ایسی بھی شام کر دینا

نصیب تیرے ہیں مجھ سے بلند بادِ صبا!
درود پڑھ کے مرا بھی سلام کر دینا

ترے لیے کوئی مشکل نہیں مرے مولا!
سرُورِ کیفِ حضوری دوام کر دینا

ہر ایک سانس میں میں مدحتِ رسولؐ کروں
عطا مقام یہ ربّ الانام کر دینا

تری ہی یاد میں شہناز کی یہ عمر کٹے
دعا قبول یہ خیرُ الانام کر دینا

درِ مصطفیٰ

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

مِرے حرف کو جو ملی صدا
مِرے جذب نے مجھے دی ندا

ہوئے مہرباں شہِ انبیا
ذرا دیکھ روضے کا در کھُلا

ہے دعاؤں کا تری یہ صلہ
تُو بصد نیاز جبیں جھکا

ہوئی مستجاب تری دُعا
تجھے مل گیا درِ مصطفیٰ

تیری سجدہ ریز ہو ہر نظر
درِ مصطفٰےؐ کا طواف کر

صلّی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلّم

غزلیں

بشارتیں ہُوا کرتی ہیں رُوح میں تخلیق

درونِ دل نہیں پاتی ہیں وسعتِ تسخیر

مرے وجُود میں برپا ہوا اک قیامت سی

نکال پھینکے مری ہستی آتشیں لاوا

شررِ تمام ہی میری زبان بن جائیں

زمیں پہ پھیلیں نیا آسمان بن جائیں!

لبِ ساحل نئی اک راہ دکھا دی غم نے
اور پھر آخری کشتی بھی جلا دی ہم نے

مل ہی جائے مری تعبیر کو شاید اک خواب
عکسِ دیوار پہ تصویر بنا دی ہم نے

رُوح کو جسم کی اس قید میں رکھنے کیلئے
بزمِ امید ستاروں سے سجا دی ہم نے

ڈوبتی شام میں کرنوں کو بچانے کیلئے
ریت کے گھر پہ بھی دیوار اٹھا دی ہم نے

تیرگی حد سے بڑھی دل کے نہاں خانوں میں
بھولنے والے تری یاد جلا دی ہم نے

ہم اسیرانِ انا، تشنہ لبِ بام گئے
بازیٔ زیست بھی داؤ پہ لگا دی ہم نے

بے لکھو کر دیا ھے

*

میں کھو گئی ہوں مگر اب گمان بولے گا
مکیں بغیر یہ خالی مکان بولے گا

فصیلِ جسم کی اس قید سے رہا ہو کر
حصارِ روح میں باقی گیان بولے گا

زمانے بھر کی سمیٹی ہے تیرگی شب نے
ملے گی جب بھی زبان، آسمان بولے گا

چراغِ جاں ہے فروزاں ہتھیلیوں پہ مری
ہوا کا جھونکا مری داستان بولے گا

نقوشِ رسمِ وفا ثبت کر دیے شہناز
مری صدا پہ یہ سارا جہان بولے گا

ترے ہمراہ چلنا چاہتی ہوں
سہارا دو، سنبھلنا چاہتی ہوں

کیا ہے منجمد افکارِ جاں نے
میں پتھر ہوں، پگھلنا چاہتی ہوں

اٹھا دے غیب سے پردہ کوئی تو
حوادث میں سنبھلنا چاہتی ہوں

بھلا کر وعدۂ فردا کو اب میں
نئے سانچے میں ڈھلنا چاہتی ہوں

کسی گُم گشتہ ساعت کی طرح اَب
میں ذہنوں سے نکلنا چاہتی ہوں

صلیبِ وقت کندھوں پر اٹھا کر
میں تھوڑا تیز چلنا چاہتی ہوں

* زندگی کا حصار مشکل ہے
موت کا انتظار مشکل ہے

لاش اپنی اٹھا کے چلنا تو
ہمسفر بار بار مشکل ہے

تم لہو سے بھی لالہ زار کرو
پتھروں پر بہار مشکل ہے

آنکھ شاید کبھی لگی ہو گی
رتجگوں کا شمار مشکل ہے

شب گزیدہ مسافروں کیلئے
صبح کا انتظار مشکل ہے

بھر چکے ہیں تمام پیمانے
خود پہ اب اختیار مشکل ہے

رُت بچھڑنے کی آگئی شہناز
اعتبارِ بہار مشکل ہے

اب جنوں کی انتہا ہونے کو ہے
کیا خبر کیا سانحہ ہونے کو ہے

تنکے چُن چُن آشیاں جس کو کیا
گھر وہی رزقِ ہوا ہونے کو ہے

آپ کی امت میں پھر تکرار ہے
کیا یہاں پھر کربلا ہونے کو ہے

توڑ ڈالیں آج سب قصرِ انا
راستہ سب کا جُدا ہونے کو ہے

موت رقصاں ہے بگولوں کی طرح
ہر خوشی گویا فنا ہونے کو ہے

روشنی اور گھن گرج کی گونج ہے
شہرِ انساں بے صدا ہونے کو ہے

سانس روکے دم بخود بیٹھے ہیں ناز
ہو چکے گر معجزہ ہونے کو ہے!

*
امن ہے حُسن ہے یہ خواب نگر لگتا ہے
الٹی ہو جائے نہ تعبیر یہ ڈر لگتا ہے

شہرِ آشوب کے سارے ہی مقفل ہیں کواڑ
جو نظر آتا ہے وہ ساتواں در لگتا ہے

ذہن کے بند دریچے میں اُتر کر آ جا
بِن ترے سارا نگر، آج کھنڈر لگتا ہے

شبِ تاریک میں کس جا پہ بسیرا کر لوں
ہر گھروندہ ہی یہاں ریت کا گھر لگتا ہے

تھا جواں عزم تو دشوار کوئی راہ نہ تھی
اب تو دشوار یہ جیون کا سفر لگتا ہے

راہ تاریک ہے منزل کا نشاں دھندلا ہے
کرمکِ شب بھی مسافر کو خضر لگتا ہے

کوئی امید کے دیپک تو جلائے آکر
[illegible]
دیکھے سارا نگر اب جو دھندلا لگتا ہے
اک جواں عزم لئے آگے بڑھو آگے بڑھو
ویسے دشوار یہ جیون کا سفر لگتا ہے

فسوں زدہ ہوں تمناؤں کے حصار میں ہوں
دبیز گہرِ شبستاں ہے میں غبار میں ہوں

کہاں یہ ڈھونڈ رہی ہے مجھے شبِ بلدا
ندائے صبحِ چراغاں کے انتظار میں ہوں

ستارگاں بھی مجھے معتبر نہیں لگتے
میں ایک جبرِ مسلسل کے اختیار میں ہوں

برس رہی ہے کڑی دھوپ آسمانوں سے
ازل سے ربّتِ بہاراں کے اعتبار میں ہوں

نوشتہ جو بھی ہو خاموش لب رہے ہیں مرے
ہے فیصلہ یہ اُسی کا میں کس شمار میں ہوں

٭ ڈوبتی شام کا سایہ ہوں میں ڈھل جاؤں گی
تیری دنیا سے کہیں دُور نکل جاؤں گی

میرا موہوم تمناؤں سے دامن بھر کے
تو نے سمجھا کہ کھلونوں سے بہل جاؤں گی

چلتے چلتے کبھی مل جائے گی منزل مجھ کو
گرتے گرتے میں کسی روز سنبھل جاؤں گی

تُو نے جو آگ مرے دل میں فروزاں کی ہے
صُورتِ شمع اسی آگ میں جل جاؤں گی

چاند کے روپ میں سو بار مرے سامنے آ
کوئی نادان نہیں ہوں کہ مچل جاؤں گی

زندگی میری بدل کر تُو بدل لاکھ مگر!
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ بدل جاؤں گی

اس کی یادوں کو سجاؤں گی لہُو سے شہناز
کر کے تعمیر حسیں تاج محل جاؤں گی

☆

اپنے ہی آپ کو بُھلا رکھنا
یہ رویّہ سدا روا رکھنا

سوئی خواہش کو جاگنے دینا
دل پہ پہرے نہ تم بٹھا رکھنا

بھید دل کا نہ کھول دیں آنکھیں
چلمنوں کو ذرا گرا رکھنا

تاب دل کو نہیں ہے لمحہ بھر
اب نہ صدیوں کا فاصلہ رکھنا

زندگی نام ہے تسلسل کا
منزلوں تک یہ سلسلہ رکھنا

کون جانے وہ پھر پلٹ آئے
آخرِ شب دیا جلا رکھنا

لاکھ شہناز مشکلیں آئیں
زندہ رہنے کا حوصلہ رکھنا

چاند خوابوں کے ڈھل رہے ہوں گے
خواب آنکھوں میں پل رہے ہوں گے

کوئی دستک نہیں سماعت پر
خواب رستے بدل رہے ہوں گے

جگنوؤں کے شرر بکھرنے سے
ہاتھ پھولوں کے جل رہے ہوں گے

ٹوٹتی ہے یہ سرد خاموشی،
برف موسم پگھل رہے ہوں گے

بجلیاں سی فضا میں رقصاں ہیں
آئینے رُخ بدل رہے ہوں گے

پاس آ کر یوں چلے جانا اُسے اچھا لگا
بھرتے پیمانوں کو چھلکانا اُسے اچھا لگا

تہلکہ مچ جائے جگ میں اس کے جشنِ ذات کا
آتشِ دل سوز بھڑکانا اُسے اچھا لگا

عشق کی ناؤ بہا کر ہجر کے پانی میں یوں
کہنا میرے پاس مت آنا اسے اچھا لگا

چار سُو نمیں زرد دھوپیں اور تنہائی کا خوف
سبز موسم میں پلٹ آنا اسے اچھا لگا

حوصلہ اس میں نہ تھا تجدیدِ الفت کا مگر
چپکے چپکے مات بھی کھانا اُسے اچھا لگا

*

دائرہ اپنا مکمل کر کے آہستہ سے پھر
کنجِ ہستی سے نکل جانا اُسے اچھا لگا

* جب آرزو نہیں تھی کوئی مدّعا نہ تھا
درپیش میرے دل کو کوئی مرحلہ نہ تھا

ایسے بھی کارواں ملے راہِ حیات میں
ہر شخص ہمسفر تھا مگر آشنا نہ تھا

ہر نقش پر جبینِ محبت نہ جھک سکی
جو نقش بھی ملا وہ ترا نقشِ پا نہ تھا

رودادِ غم زباں پہ لاتے تو کس طرح
محفل میں تیری کوئی بھی غم آشنا نہ تھا

ہم سوچتے تھے ترکِ وفا میں ہے عافیت
ترکِ وفا کا دل کو مگر حوصلہ نہ تھا

مشکل کے وقت نام تھا تیرا زبان پر
یہ آسرا تھا اور کوئی آسرا نہ تھا

میری یہ کم نصیبی کہ مانگا نہ میں نے کچھ
میری زباں پہ کوئی بھی حرفِ دعا نہ تھا

رحمت کا باب کھلنے کی تھی منتظر نگاہ
در کونسا تھا ایسا جو مجھ پر کھلا نہ تھا

دنیا ہماری راہ کی دیوار بن گئی
ورنہ دلوں میں اپنے کوئی فاصلہ نہ تھا

سب کچھ خدائے عشق کے تھا اختیار میں
لیکن مری وفاؤں کا کوئی صلہ نہ تھا

شہنازؔ ہم نے ایسے گزاری ہے زندگی
دنیا میں جیسے کوئی ہمارا خدا نہ تھا

* اب گرمیِ امروز قبا ڈھونڈ رہی ہے
اس گنبدِ بے در میں صدا ڈھونڈ رہی ہے

دم گھٹنے لگا ہے حبسِ شعلۂ جاں سے
مصلوبِ تمنّا ہے بقا ڈھونڈ رہی ہے

جس پر نہ لگا ہو کہیں سنّاٹے کا پیوند
پھر ظلمتِ شب ایسی ردا ڈھونڈ رہی ہے

کیا قرض ابھی باقی ہے کچھ اور جہاں پر
مضروبِ محبت ہے وفا ڈھونڈ رہی ہے

شہناز اب ادراک کی ایسی بھی کمی کیا
اس بستیِ انساں میں خدا ڈھونڈ رہی ہے

آج اپنی دعاؤں میں اثر دیکھ رہی ہوں
میں شامِ مقدّر پہ سحر دیکھ رہی ہوں

ہاتھوں میں لیے آج میں کشکولِ گدائی
یزداں تیرا فیضانِ نظر دیکھ رہی ہوں

اشکوں کے بجھے دیپ جلا کر مرے باسط
جانب میں تری بارِ دگر دیکھ رہی ہوں

وحشت تری ہو جائے گی گم اے دلِ وحشی!
بدلی ہوئی قاتل کی نظر دیکھ رہی ہوں

جھلسائے نہ شیشے کے یہ اجسام تمازت
بڑھتے ہوئے آنگن میں شجر دیکھ رہی ہوں

کچھ دیر ٹھہرنا ہی پڑے گا تجھے شہناز
اس بستیِ امکان میں گھر دیکھ رہی ہوں

شعلہ نوائیوں کی سزا دیجئے مجھے
محفل عروج پر ہے اٹھا دیجئے مجھے

سب جانتے ہیں کتنے ہیں شیریں بیان آپ
لفظوں کے زیر و بم میں بہا دیجئے مجھے

ہوں کم نگاہ میں تو بلندی پہ آپ ہیں
اسرارِ ہست و بود بتا دیجئے مجھے

کیوں بازگشت میری سنا چاہتے ہیں آپ
اپنا سمجھ کے پھر سے صدا دیجئے مجھے

راہوں کے پیچ و خم میں گزاری ہے زندگی
منزل کوئی نئی بھی دکھا دیجئے مجھے

شہناز نے بھی سیکھا نہیں ہار ماننا
اب فیصلہ بھی اپنا سنا دیجئے مجھے

دیے میں انا کے جلانے لگی ہوں
میں سورج نیا ساتھ لانے لگی ہوں

بھٹکتے بھٹکتے بہت تھک گئی ہوں
نیا اک جہاں میں بنانے لگی ہوں

سنبھالو کہ ترکش میں ہیں تیر جتنے
مقدر میں پھر آزمانے لگی ہوں

تجھے جال میں اب نہ الجھا سکو گے
تمہیں ناخدا میں بنانے لگی ہوں

ہواؤں کے رخ پر سفینے بہا کر
میں بجھتا دیا پھر جلانے لگی ہوں

دوست بن کر دوستوں کی بے وفائی دیکھیے
کج ادائی دیکھیے ، بے اعتنائی دیکھیے

رہ گذارِ شوق میں ہم رکھ تو بیٹھے ہیں قدم
جانے کب منزل پہ اپنی ہو رسائی دیکھیے

میرے سجدوں کے مقدّر میں وہ سنگِ در نہ تھا
میری پیشانی پہ داغِ نارسائی دیکھیے

عشق میں نام و نسب کا کس کو رہتا ہے خیال
ہے نصیبِ عشق میں تو جگ ہنسائی دیکھیے

زندگی میں ہم نے دیکھیں الجھنیں ہی الجھنیں
الجھنوں سے کس طرح ہو گی رہائی دیکھیے

زندگی کا ایک پل بھی چین سے گزرا نہیں
جب سے کی تسلیم دل کی رہنمائی دیکھیے

آپ نے ناراض ہو کر جب سے آنکھیں پھیر لیں
میری دشمن بن گئی ساری خدائی دیکھیے

جل رہی ہوں کب سے اے شہناز اپنی آگ میں
رنگ لائے گی مری شعلہ نوائی دیکھیے

اس حقیقت کا مرے دوست ہے اقرار مجھے
میں گنہ گارِ وفا ہوں نہیں انکار مجھے

میرا مذہب ہے محبت، مرا مشرب ہے وفا
دشمنوں سے بھی ہے اپنوں کی طرح پیار مجھے

خامشی ہے مری احساسِ ادب کی شاہد
کون کہتا ہے نہیں جرأت اظہار مجھے

منزلِ حق و صداقت میں ہوں سرگرم سفر
رہ بدلنے نہیں دیتا مرا کردار مجھے

درد و آلام نے لُوٹا ہے مرا صبر و سکوں
چھاؤں دنیا میں مسرّت کی نہی درکار مجھے

غیر تو غیر ہیں غیروں سے گلہ ہو کیونکر
اب تو اپنے بھی سمجھنے لگے اغیار مجھے

میں ہوں خاموش یہ اک رازِ نہاں ہے شہناز
یہ غلط ہے کہ نہیں جرأتِ اظہار مجھے

تجھ سے ہو ہمکلام، سخن آشنا بھی ہو
دعویٰ ہے ہمسری کا، شریکِ دعا بھی ہو

کندن ہوا ہے دھوپ میں شیشے کا پیرہن
شامل اب اس میں سرخیٔ رنگِ حنا بھی ہو

منسوب تیرے نام سے لَو اس کی میں کروں
روشن کہیں، جو دُور چراغِ ہُدا بھی ہو

پہچاننے کا خود کو بہت اشتیاق ہے
اپنے لیے کہیں پہ رُخِ آئینہ بھی ہو

شہناز یہ تو ذوقِ مسافت میں شرط ہے
ذوقِ جنوں کی راہ میں ذوقِ انا بھی ہو

کوئی مجھے آ کر سمجھائے
میں نے بھی تھے خواب سجائے

رستہ خودسر ایسا ٹھہرا
منزل سے بھی آگے جائے

پیار کے دو لفظوں کی خاطر
رین بسیرے سب ٹھکرائے

آنسوں کے کچھ دیپ جلا کر
باقی سارے دیپ بجھائے

رم جھم رم جھم کرتا ساون
برہن من میں آگ لگائے

رشتے ناطے توڑ کے پگلی
ہاتھ پہ ہاتھ دھرے پچھتائے

ذہن دریچے بند نہ کرنا
شاید پگلی پُروا آئے

من مندر روشن رکھنے کو
میں نے دل کے زخم جلائے

من اندر گھر کرنے والی
مٹھڑی بتیاں کون بھلائے

چھوڑ دے اب شہناز تپسیا
من اندر بھگوان در آئے

… دوسری کتاب میں ہے

وفا پرست نہیں، جو وفا شعار نہیں
وہ شخص کیا جسے انسانیت سے پیار نہیں

فریب کھائے ہیں دنیا میں اس قدر میں نے
ترا تو کیا، مجھے اپنا بھی اعتبار نہیں

بجائے پھولوں کے، شاخوں پہ زخم خنداں ہیں
تھے انتظار میں جس کے یہ وہ بہار نہیں

سوائے درد کے کوئی نہیں مرا مونس
سوائے غم کے کوئی میرا غمگسار نہیں

بہا رہا ہے مرا دل تو خون کے آنسو
خدا کا شکر مِری آنکھ اشکبار نہیں

قصور میرا ہے میں نے ہی اس کو چاہا تھا
گناہ گار ہوں میں، وہ گناہ گار نہیں

کنارہ کر لیا دل سے بھی اپنے اے شہناز
جہاں میں کوئی بھی اب میرا رازدار نہیں

روشن جو ایک آنکھ سرِ بام ہو گئی
کیا پھر سے کوئی صبح مرے نام ہو گئی

عمرِ دراز کاٹ کے مجھ کو ملا عروج
پہنچی جو بام پر تو مری شام ہو گئی

مجھ کو نہ شوق تھا کہ ہو پہچان یوں مری
ہوتے ہوئے بھی نام مَیں گمنام ہو گئی

شہناز تیری خواہشِ وارفتگی ہے خوب
پردہ اٹھا تو لرزہ بر اندام ہو گئی

٭ دل نے ترے خلوص پہ سب کچھ لُٹا دیا
تُو نے نہ چاہتوں کا ہماری صِلہ دیا

کھا کھا کے زخم خون سے بھر لی ہیں انگلیاں
جو خار تیری راہ میں پایا ہٹا دیا

قربت تری نہ اپنے نصیبوں میں ہو سکی
تُو نے تو دُوریوں کو مقدّر بنا دیا

اے دوست تیرے حسنِ تغافل کی خیر ہو
تُو نے ہمیں ہماری نظر سے گرا دیا

کس کو سنائیں چاکِ گریباں کی داستاں
دنیا میں تُو نے ہم کو تماشہ بنا دیا

انصاف سے بتا ذرا دکھ درد کے سوا
شہنازؔ کو تمہاری محبت نے کیا دیا

لمحۂ موجود کی ظُلمت میں در آئے گا کب؟
اک نیا سورج مری دہلیز چمکائے گا کب؟

تیرگی کا ڈر نہیں ترسی ہوئی کرنوں کو ہوں
قافلہ تاروں کا میرے گھر اُتر آئے گا کب؟

خوشبوؤں کی آس میں رقصاں رہی تتلی کے سنگ
وادیِ گُل تک صبا یہ قافلہ جائے گا کب؟

چونچ میں کنکر لیے بیٹھی ہوئی ہوں تشنہ لب
کوزۂ امید میرا پھر سے بھر جائے گا کب؟

منزلیں شہناز حائل ہیں تری ہر راہ میں
راستہ منزل کو تجھ سے دور لیجائے گا کب؟

میں اپنے بریدہ ہوں کیسے سفر کی بات کروں
ڈسا ہے شب نے میں کیسے سحر کی بات کروں

کُھلے دریچے ہیں سارے ہواؤں کی زد میں
مَیں کس مکان کی کس بام و در کی بات کروں

مَیں اپنے جذب کو الفاظ دے نہیں سکتی،
تو کیوں میں تجھ سے کسی نامہ بر کی بات کروں
میں کیسے بھولے ہوئے خود و خُدری بات کروں

مرے ندیم، مرے ہمسفر، مرے ساتھی!
چلیں جو ساتھ تو چاکِ جگر کی بات کروں

لگی ہے درد کی زنجیر ٹوٹنے شہناز
جو چارہ گر ہوں تو دامانِ تر کی بات کروں

مرے اندر دہکتے ہیں جو انگارے بجھا دو نا
بکھرتے خواب آنکھوں میں مری پھر سے سجا دو نا

بہت سے رتجگے آنکھوں میں میری اس نے بوئے ہیں
مری کھوئی ہوئی نیندیں مجھے واپس دِلا دو نا

یہ مسکن پتھروں کے چھین لیتے ہیں حسیں سوچیں
گھروندے ریت کے ساحل پہ آکر پھر بنا دو نا

بہت بنتی بگڑتی صورتیں ہیں من کے مندر میں
مرے اندر جو آذر ہے اسے آکر مٹا دو نا

بنا پتوار کشتی ڈولتی ہے موجِ دریا پر
ہوا کے رخ پہ اس کو اک نیا ساحل دکھا دو نا

میں ہوں کنجِ قفس میں، حسرتِ پرواز رکھتی ہوں
سو تم مجھ پر بریدہ کو ذرا اڑنا سکھا دو نا

بناءِ جرمِ وفا دورِ احتساب میں ہوں
خوشا نصیب محبت کے انتساب میں ہوں

دلِ شکستہ پہ بھاری ہے زردیِ اصنام
تلاشِ صبحِ بہاراں ہے، اضطراب میں ہوں

کہو زمان و مکاں سے کہ میرے ساتھ چلیں
ہے تیز رخشِ سفر، میں نہ رکاب میں ہوں

تلاشِ اہلِ نظر ہی مجھے کرے گی کبھی
ورق میں سادہ کسی اَن کھُلی کتاب میں ہوں

گُلوں کے سنگ برستے ہیں مجھ پہ سنگ یہاں
بہت خوشی ہے زمانے کے انتخاب میں ہوں

صدائے چارہ گراں ہے مِرے تعاقب میں
گھری ہوئی میں تمنّاؤں کے سراب میں ہوں

اَنی ہے گردشِ دوراں کی منتظر شہنازؔ
صلیبِ وقت کے تازہ نئے نصاب میں ہوں

نظمیں

نعت

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہٖ الکریم

ان کی تعریف کی مجھ میں ہے بھلا تاب کہاں
لفظ خاموش ہیں ملتی نہ بیاں کو ہے زباں
مَیں زمیں میں ہی ندامت سے گڑی جاتی ہوں!
مَیں خطاکار نگوں سار ہوئی جاتی ہوں!

نہ مجھ سے پورا ہوا زندگی کا فرض یہاں
بھلا چکاؤں گی کیسے میں جا کے قرض وہاں
شفاعتوں کی طلب گار ہوں میں صلِّ علیٰ
کہ روزِ حشر چھپا لے گی رحمتوں کی ردا

"ظلمتِ شب کو ملی آپؐ کی عظمت سے ضیا
مرحبا صلِّ علیٰ صلِّ علیٰ صلِّ علیٰ!"
اسوۂ ذات سے ظاہر ہے قرآنی تفسیر
خوابِ آدم کو ملی ایک انوکھی تعبیر

منتظر تھی میں ازل سے کہ مجھے اذن ملے
ہو بیاں مدحتِ مکّیؐ مدنیؐ العربی
"اے قریشیؐ لقبی ہاشمی و مطّلبی
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی!"

ہے ساتھ صلِّ علیٰ کا مجھے نہیں ہے ملال
بڑھا رہی ہوں اسی آس پر میں دستِ سوال
صدا کی سیڑھی مرے حرفِ نارسا کو ملے
قبولیت کا شرف میری ہر دعا کو ملے

کُن فکاں

نہ کُن کہا تھا جو تو نے زماں میرے تھے
یہ آسماں یہ زمیں سب مکاں میرے تھے

یوں کُن فکاں نے جہاں کر دیا مرا محدود
ہیں عرش پر تو ملائک زمیں پہ خاکی وجود

اے لامکاں کے مکیں تُو ہے ہر جگہ موجود
شہود و شاہد و مشہود سب ~~تیرے~~ مسجود

میں اپنا آپ نہ کیوں اب چھپاؤں دنیا سے
مرے وجود میں بستا ہے آپ تیرا وجود

وقت کی دہلیز کا آخری لمحہ

ہوں وقت کی دہلیز کا میں آخری لمحہ
ٹوٹے ہوئے تاروں سے صدا آتی رہے گی
بے رحم حقائق کی کڑی دھوپ ہمیشہ
وجدان تو کیا روح کو جھلساتی رہے گی

خوش آئند لمحوں کی تلاش

ہوں اپنی فکر و انا کی قیدی
میں دائروں کی اسیر ہو کر
مکیں ہوں ایسے مکان کی جو
گماں گزرتا ہے گھر نہیں ہے
اندھیروں کے سرسراتے پیکر
اترتے رہتے ہیں بستیوں پر
کرن کرن کو ترسنے والے
اندھیری بستی میں بسنے والے
تلاشنے کو نکل پڑے ہیں
چھپا کہیں آفتاب ہو گا

کبھی تو کم یہ عتاب ہو گا
کوئی تو ہو گا جو بستیوں میں
چراغاں کرنے کا عزم لے کر
دِیوں کو لو بانٹتا پھرے گا
شبِ سیہ کو چراغ دے کر
رُخِ سحر کو اُجال دے گا

ہے دُور بہت دُور سرحدِ امکاں!

یہ سفرِ امکاں ہے سوچتی ہوں
یہ لاشعوری سفر ہے میرا
شعور کی منزلوں کی جانب رواں دواں ہوں
مگر رضائے نفس بنا تو
بہت ہی مشکل ہے منزلوں کے نشان پانا
مجھے ہے سوچوں کے پار جانا
میں اپنے خوابوں سے ڈر رہی ہوں
یا پھر سرابوں سے ڈر رہی ہوں
میں خود ہی خود میں سمٹ رہی ہوں
میں راستے سے پلٹ رہی ہوں
قدم بڑھاتی ہوں، سوچتی ہوں

میں آگے جاؤں یا لوٹ آؤں
یہ سفر امکاں ہے
لامکاں تک
فصیلِ جسم و جہاں سے آگے ہے مجھ کو جانا
سفر کٹھن ہے یہ میں نے جانا
قدم ہیں بھاری
سفر ہے طاری
میں فیصلوں میں الجھ گئی ہوں
بکھر گئی ہوں غبار بن کے
میں خواب گر ہوں
طلب کا اک دشت ساتھ لے کر
میں خواہشوں کے گلاب لے کر
ادھورے سے چند خواب لے کر
قدم میں آگے بڑھا رہی ہوں
میں آگے بڑھتی ہی جا رہی ہوں
ہوں اپنی جرأت پہ آپ حیراں
جو پیچھے دیکھوں تو ایک جنگل

نظر کے آگے بلندیاں ہیں
مَیں پستیوں سے بلندیوں تک سفر کروں گی
مَیں خواب گر ہوں
مجھے ہے خوابوں کے پار جانا
میں دستِ امکاں بڑھا رہی ہوں
یہ سفرِ امکاں ہے
لامکاں تک!

لوحِ بصارت

وہ منظر نقش ہے اب بھی
مری لوحِ بصارت پر
دبی سب حسرتیں سب خواہشیں
سب خواب پورے تھے
نگہ کے سامنے وہ تھا
کہ جس کی آرزو کی تھی
مرے یزداں نے میرے جذب کی تکمیل کر دی تھی!

بچھڑی ساعتوں کا دائرہ

وہاں پر کون ہو گا
زرد دھوپوں میں جو سرما کی
مرے موسم مرے ہمراہ بیٹھا سوچتا ہو گا
تصور کے دریچے وا کیے ہوں گے وہاں اس نے
بدلتی رُت کی ہر برسات اترے گی تصوّر میں
درختوں پہ گری شبنم کو بیٹھا دیکھتا ہو گا
مرے موسم مرے ہمراہ بیٹھا سوچتا ہو گا
برہنہ شاخِ گُل پر برف گرتی جا رہی ہو گی،
سماں بر فاب موسم کا اسے پاگل بنا دے گا
دہکتی آگ تنہائی کی سینے میں چھپا کر وہ

نشاں برفاب جھیلوں کے کہیں پر ڈھونڈتا ہو گا
مرے موسم مرے ہمراہ بیٹھا سوچتا ہو گا
کبھی برقِ تپاں بھی یاد میں چمکی تو ہو گی نا
کبھی رِم جھم کی دھیمی رُت بھی گدلائے گی آنکھوں کو
ہر اک منظر پسِ منظر بدل ڈالے گا پل بھر میں
کھُلی آنکھوں سے سپنے دیکھنا عادت رہی ہو گی
وہ اکثر بیٹھ کر تنہا —— مرے موسم مرے ہمراہ بیٹھا دیکھتا ہو گا!

سفرِ ذات

کڑی دھوپوں نے اب ڈیرہ جمایا ہے مرے اندر
غرض مندی کا اک کشکول اپنے ہاتھ میں لے کر
میں اپنی ذات کے صحرا میں ہو جاؤں نہ گم جاناں
مجھے درپیش ہے جاناں سفرِ ذاتِ انا کا بھی
مجھے تسخیرِ ذاتِ جسم و جاں سے آگے جانا ہے
مجھے ڈر ہے مرے کج راستے ہیں منزلیں آ کر
مری درماندگی کو ایک ٹھنڈی چھاؤں دکھلا کر
مجھے اپنے فسوں میں مستقل محصور کر لیں گی
مجھے رستہ بدلنے پر بھی وہ مجبور کر دیں گی

کڑی اس دھوپ نے جو حُسن بخشا ہے مجھے جاناں
تمازت جس کی بن کر نور چہرے پر جھلکتی ہے
مجھے منزل سے پیاری ہے!!
مٹا دو سب نشاں منزل کے، یہ رستے میں حائل ہیں
مجھے تسخیرِ ذاتِ جسم و جاں سے آگے جانا ہے!

//

آس کا جنگل

اک آس کے جنگل میں کھو کر
میں اپنا آپ گنوا بیٹھی
رُخ موڑا سُکھ کی چھایا نے
نِت جوت غموں کی جگا بیٹھی

اس جگ سے پربت لگا بیٹھی
مَیں کیسا دھوکا کھا بیٹھی
مَیں کا ہے پریت لگا بیٹھی

تاریک تھا آسوں کا جنگل
منزل کی راہ بھُلا بیٹھی

اک پیار کا دیپ جلا کر میں
اب سارے دیپ بجھا بیٹھی

میں کاہے روگ لگا بیٹھی
میں کاہے دھوکا کھا بیٹھی
میں کاہے پیت لگا بیٹھی

میں بے بس ہوں من بے قابو
ان نینوں میں تھا کیا جادو
بن سوچے بن سمجھے آلی
میں اپنا اس کو بنا بیٹھی

تن من کی سُدھ بسرا بیٹھی
میں کاہے دھوکا کھا بیٹھی
میں کاہے پیت لگا بیٹھی

مقصد پانے کی جلدی میں
میں ریت پہ نقش بنا بیٹھی
بن سوچے سمجھے منزل کے
سب رستے آپ مٹا بیٹھی

اس جگ سے پریت بڑھا بیٹھی
میں کاہے دھوکا کھا بیٹھی
میں کاہے پیت لگا بیٹھی

یادوں میں اس کی کھو گئی میں
چپکے سے اس کی ہو گئی میں
میں آ کر اس کی باتوں میں
سکھ اور چین گنوا بیٹھی

میں دل میں پریت بسا بیٹھی
میں کاہے دھوکا کھا بیٹھی
میں کاہے پریت لگا بیٹھی

من اندر بیٹھا پی میرا
رٹ پی پی کی ہیں لگا بیٹھی
من کا دروازہ بند کر کے
میں کاہے پی کو بھلا بیٹھی

انجان تھی دھوکا کھا بیٹھی
میں کاہے روگ لگا بیٹھی
میں کاہے بہت بڑھا بیٹھی

من کا دروازہ کھول پیا
تو اندر میرے بول پیا
سنگ ہے تیرا انمول پیا

اب بول پیا اب بول پیا
من کا دروازہ کھول پیا

سب رشتے ناطے توڑ چکی
ہیں دنیا سے منہ موڑ چکی
اب تیرے دوارے آ بیٹھی
اس جگ سے پریت ہٹا بیٹھی

انجان تھی دھوکا کھا بیٹھی
اب جگ سے پریت ہٹا بیٹھی
اب تیرے دوارے آ بیٹھی

مُکھ اب تو اپنا کھول پیا
نہ عمل کو میرے تول پیا
دُکھ جیون میں نہ گھول پیا
اب بول پیا اب بول پیا

میں تیرے دوارے آ بیٹھی
اس جگ سے پریت ہٹا بیٹھی

 16

ناداں تھی دھوکا کھا بیٹھی

اب جگ سے پریت ہٹا بیٹھی

مُکھ اب تو اپنا کھول پیا

اب بول پیا اب بول پیا!

سوال

درد الاؤ کیسے جلے گا
آتشیں لاوا کب پگھلے گا
آخری شعلہ کب بھڑکے گا
خوابِ فردا کس کو ملے گا
رات کا دریا کب اترے گا
صبح کا سورج کب نکلے گا
دل دیوانہ کب سنبھلے گا

؟

پندارِ ضبط

ضبطِ گریہ نے عجب سوزِ دروں بخشا ہے
سازِ خاموش سے آواز نکلتی ہی نہیں
لاکھ لفظوں کے الاؤ مجھے جھلسا ڈالیں
میرے ہونٹوں پہ جمی برف پگھلتی ہی نہیں

ننھّی چڑیاں

صبح سویرے نُور کے تڑکے
آنکھ مِری جب کھلتی ہے
لے کر نام خدا کا میں
آغاز سحر کا کرتی ہوں

آنگن میرا بھر جاتا ہے
ننھّی منّی چڑیوں سے
بعد تیری حمد و ثنا کے
دانا دُنکا چُگتی ہیں!

اِک دُوجے سے چُہلیں کرتی
کتنی سُندر لگتی ہیں!

چھوٹے چھوٹے ٹکڑے میں
روٹی کو بھورکے کرتی ہوں
ان کو کھائیں ننھی چڑیاں
آنگن میں رکھ دیتی ہوں
دعوت دیتی ہوں انگنا میں
میں خوش رنگ پرندوں کو
مینا کو، کوئل کو
اور منّی سی ایک گلہری کو
روٹی کھانے آجاتے ہیں
کالے کالے کوّے بھی
اپنی فطرت کی عیّاری
یاں بھی وہ دکھلاتے ہیں
پنجہ بڑھا کر ننھی چڑیوں کا
حصّہ وہ کھا جاتے ہیں
میں یہ سارا کھیل تماشا
چھُپ کر دیکھتی رہتی ہوں

دوڑ کے پھر آنگن میں جا کر
ان کو دُور بھگاتی ہوں
کھائیں ننھے دوست مرے
ڈھال ان کی بن جاتی ہوں
ننھے پرندے کھانا کھا کر
پُھر سے پھر اُڑ جاتے ہیں
من میں میرے جانے کتنی
خوشیاں وہ بھر جاتے ہیں

کربِ آگہی

خوشبو ہو تم فضا میں بکھر کے تو دیکھنا
ہمراہ موسموں کے سنور کے تو دیکھنا
کیا کچھ چھپا ہوا ہے خلائے بسیط میں
اس کربِ آگہی سے گذر کے تو دیکھنا

عشقِ پریشاں

کون سوئے ہوئے فتنوں کو جگانے آیا
کون اُجڑے ہوئے اس گھر کو بسانے آیا
عمر بھر عشقِ پریشان نے ڈھونڈا مجھ کو
آج یہ بات مجھے کون بتانے آیا

18

من کی اکھیاں

بن میں کُوہ کُوہ کرتی کوئل
پی کو پاس بلائے
دانا دنکا چگنے والا
پیٹ بھرے اڑ جائے
درشن کی پیاسی جوگنیا
نگر نگر منڈلائے
دان کرے درشن جل کوئی
نین پیاس بجھائے
من اندر ہے پی کی مورت
بیاکل دیکھ نہ پائے
من کی اکھیاں روشن کرلے
پی کے درشن پائے!

قرضِ وفا

وہ مری زیست کا پیمبر تھا
لوگ کہتے ہیں وہ ستمگر تھا

وہ جو جُھکتا تو کس طرح جُھکتا
اس کے آگے انا کا پتھر تھا

میں نے پتھر سے پھوڑ ڈالا سر
ایک قرضِ وفا مرے سر تھا

خود فریبی

یہ محبت بھی کیا عجب شے ہے
خود فریبی کا ساتھ دیتی ہے
میری ہستی ہے تیرے ہجر میں گم
کتنے انھونے خواب بُنتی ہوں
پھول یادوں کے تیری چُنتی ہوں
دوش میں تجھ کو دے نہیں سکتی
تیری ہر بات کو سمجھتی ہوں
تیرے جذبات کو سمجھتی ہوں
پھر بھی میں اعتبار کرتی ہوں
اور ترا انتظار کرتی ہوں
جانتی ہوں کہ تو بھی میرے بغیر

کتنا تنہا سا لگ رہا ہو گا
اور میری طرح سے تیرا بھی
دل وہاں پر نہ لگ رہا ہو گا
اور یہیں وقت کا ہر اک لمحہ
اس طرح کاٹتی ہوں گن گن کر
وقت ہو گا وہ کونسا جب تُو
میرے نزدیک آن بیٹھے گا
اور بتلائے گا یہ دھیرے سے
کیسے گزرا تھا وقت میرے بغیر

آواز

ایک آواز جو اکثر مجھے تڑپاتی تھی
میرے احساس کی دنیا میں بسا کرتی تھی
میرے افکار میں اک رنگ نیا بھرتی تھی
ایک دن میں اسی آواز کے پیچھے پیچھے
کہیں انجان سی راہوں پہ نکل کر چل دی
وقت کا سیلِ رواں بھی نہ مرے ساتھ رہا
نہ ہی آہٹ پہ کسی کی کبھی مُڑ کر دیکھا
راہ اَن دیکھی تھی مدھم سی رہی بینائیُ
بس وہ آواز فسوں خیز بنی جاتی تھی

آس انجان سی منزل کی وہ دکھلاتی تھی
دیپ ہر راہ میں روشن وہ کیے جاتی تھی
مجھ کو اکسائے نئی سمت لیے جاتی تھی
مجھ پہ آواز کا کچھ ایسا فسوں طاری تھا
راز پا لینے کا کچھ ایسا جنوں طاری تھا
کوئی بھی چیز مری راہ میں حائل نہ ہوئی
تندیِ بادِ مخالف سے بھی گھائل نہ ہوئی
مرے جذبات کے دھارے نہ کوئی روک سکا
کوئی بھی تند و بلا خیز امڈتا طوفاں
وہی آواز مرے شوق کو بھڑکاتی تھی
سوئے منزل مجھے دوڑائے لیے جاتی تھی
میری پرواز جنوں خیز ہوئی جاتی تھی
آتشِ شوق بھی کچھ تیز ہوئی جاتی تھی
راستے سب مجھے منزل کا پتہ دیتے تھے
اور مرے ذوقِ مسافت کو بڑھا دیتے تھے
میری پرواز تھی آواز کی پرواز کے ساتھ
دوڑتی جاتی تھی میں وقت کی آواز کے ساتھ

منزل آئی جو نظر، دشتِ تحیّر جاگا
منتظر آنکھ یہ کہتی تھی یہ منزل ہی نہیں
راہ میں ہے مری حائل کہ ٹھہر جاؤں پھر
جرسِ رفتہ کی صورت میں بکھر جاؤں پھر
میں ہوں آواز کی قیدی میں ہوں آواز کے ساتھ
میں نے پَر باندھ لیے وقت کی پرواز کے ساتھ

تاج محل

ایک انجان سی دنیا کا حسیں تاج محل
جیسے جیون کی حسیں راہ گذر پر دیکھا
ایک مبہم سی تمنا مری موہوم امید
دور گوشے میں مرے دل کے اچانک جاگی
رک کے اس خواب کی تعبیر کو میں دیکھ تو لوں
اس کے اجمالِ فسوں خیز کی تعریف کروں
اس کے پُر نور تقدّس کے حسیں خالق کو
کس طرح نذرِ عقیدت کی مدح پیش کروں
میری ششدر سی نگاہوں کو پریشاں پاکر
پاس سے حضرتِ مجذوب نے پوچھا آکر

جذب و مستی کی بقا تُو نے کبھی دیکھی ہے
عشق و ہستی کی فنا تُو نے کبھی دیکھی ہے
فلسفہ جذب و فنا کا جو سمجھ جائے تُو
پھر تو بن جاتے ہیں کتنے ہی حسین تاج محل

تلخیِ کل

کرب اس لمحے کا میں کیسے بتاؤں جاناں
جب کھلی آنکھوں سے سب دیکھنا پڑتا ہے مجھے
اور کھلے زخم بھی کہتے ہیں، لہو رِسنے دو
جو کسک تم کو ملی ہے وہ پرائی تو نہیں
آج تو اپنے ہی لوگوں نے ڈسا ہے تم کو
زخم گہرا ہے مگر خود سے ملا ہے تم کو
ہمسفر تم ہی بتاؤ کوئی مقروضِ انا
کس طرح بارِ گراں اپنے جھکے کندھوں پر
لاد کر وقت کی اس دھوپ میں چل سکتا ہے
سینا پڑتا ہے لبوں کو مجھے مُہرِ چُپ سے
مثلِ آئینہ میں حیرت سے تکا کرتی ہوں

ٹوٹ جاتا ہے چھناکے سے طلسمِ حیرت

~~ایک ہی پل میں چھٹک جاتی ہے گذری ظلمت~~

کوئی احساس ہیں چپکے سے اتر آتا ہے

تلخیِ کل کا ہر اک لمحہ بھلانے کے لیے

مرہمِ پیار مرے زخم پہ رکھ جاتا ہے!

تشنہ لبی

کون بتلائے گا تفسیرِ محبت کیا ہے
کون بتلائے گا تکمیلِ محبت کیا ہے
کون سمجھائے گا دنیا کی حقیقت مجھ کو
کس طرح تشنہ لبی کم مری ہوگی ساقی!

؟

28

لوحِ وجود

کوئی تو ہو جو مرے ساتھ چل سکے دو پل
کوئی تو ہو جو مرے دل کی بات کو جانے
کوئی تو ہو جو مرے ہی وجود جیسا ہو
کوئی تو ہو جو مری ذات میرا حصہ ہو
کوئی تو ہو جو مری وحشتوں کی بھٹّی کو
وفا کی دھیمی پھواروں سے ماند کر ڈالے
کوئی تو ہو جو مرا صرف میرا اپنا ہو !

اصل کی تلاش

مرے ذہن کا مری سوچ کا
جدا راستہ تھا بنا ہُوا

نہ یہاں کوئی بھی خیال تھا
جو بھی تھا تیرا ہی جمال تھا

ترا قُرب ہستیِ نارسا
پھرے ڈھونڈتی ہے مرے خُدا

میں تو اپنے آپ سے ہوں جُدا
مجھے ڈھونڈنا ہے ترا پتا

مرے چارہ گر، مرے ناخدا
سُنی کیوں گئی نہ مری دعا

مری تجھ سے ہے یہی التجا!
مجھے اپنے آپ سے دے بچا

برّاق لباسوں میں سیہ دل

تیار ہوں میں کر دو قلم انگلیاں میری
جو دل میں ہے قرطاس پہ بکھرے گا وہ اِک دن
جذبات کی آندھی تو اڑا دیتی ہے سب کچھ
اور دل میں لگی آگ بھڑک جاتی ہے کچھ اور
ہوں کتنی میں بے بس کہ نظر آتا ہے سب کچھ
مظلوموں کے چہرے اور بے بس کی ہر اک آنکھ
وا ہوتی ہے اخبار میں میرے لیے ہر روز
تصویرِ ستم رہتی ہے آنکھوں کے مقابل
الفاظ کو پڑھنے کے میں رہتی نہیں قابل
دعویٰ ہے ہمیں یہ بھی کہ انسان ہیں ہم سب

30

برہم نے یہاں بھیڑیے کی کھال پہن کر
انسان کے لاشے کو کھلا چھوڑ دیا ہے
کچھ بھوک بڑھا دیتی ہیں سڑتی ہوئی لاشیں
انسان نما شیر جھپٹ لیتے ہیں بڑھ کر
اکڑے ہوئے طرّے ہیں چمکتی ہوئی کاریں
براق لباسوں میں ہیں ملبوس سیہ دل
انسان کے لاشے کو یہاں روند رہے ہیں
اقدار سے، ناموں سے سجائے گئے کالر
ہر روز نیا ایک چلا لیتے ہیں چکر
انساں نہ کہو ان کو یہ ہیں وحشی جناور
انسان ہیں انساں کا لہو چوس رہے ہیں!

قائدِ اعظم

ملتِ بیضا کی عظمت کا نشاں بن کر رہا
وہ رہا جب تک زمیں پر آسماں بن کر رہا

ناتواں تھا جسم لیکن عزم تھا اس کا بلند
دشمنوں کی راہ کا سنگِ گراں بن کر رہا

کھا رہی تھی قوم راہِ زندگی میں ٹھوکریں
رہروانِ بے اماں کی وہ اماں بن کر رہا

کارواں گم کردہ منزل تھا، فضا تاریک تھی
رہنمائی کے لیے وہ شمع ساں بن کر رہا

دشمنوں کو دانش و حکمت سے دی اس نے شکست
زندگی بھر قوم کا وہ مہرباں بن کر رہا

دشمنی کی دھوپ کی شدّت قیامت خیز تھی
منزلِ فکر و عمل میں سائباں بن کر رہا

قوم کے مردہ دلوں میں اس نے بھر دیں بجلیاں
شوکتِ اسلاف کا وہ ترجماں بن کر رہا

قوم کو ایمان کی، ایقان کی تعلیم دی
اس طرح وہ دشمنِ وہم و گماں بن کر رہا

ملکِ پاکستان اس کی کوششوں کا ہے ثمر
فکر سے اس کی یہ نقشِ جاوداں بن کر رہا

یورشِ افکار

مری سوچوں پہ پہرے ہیں زباں میری بھی اب چپ ہے
میں اس افکار کی یورش کو لے کر اب کہاں جاؤں

مرے اندر دہکتا ہے الاؤ کیسے بتلاؤں
نہاں ہیں داغ سینے میں کسی کو کیسے دکھلاؤں

مری آنکھوں سے نیندیں چھین لی ہیں کربِ پیہم نے
بتا، زخموں کا مرہم ڈھونڈنے میں کس جگہ جاؤں

مری راہوں کے سارے نقش مدھم ہو گئے ہیں اب
مرے ساتھی بھی تھک کر راستے میں سو گئے ہیں

مجھے بتلا مسیحا ڈھونڈنے تجھ کو کہاں آؤں
وگرنہ یہ ہی بتلا دے سکونِ دل کہاں پاؤں

اَن کہی خواہش

سہنا پڑتا ہے ہر اک کرب اکیلے مجھ کو
درد کی دھوپ میں تنہا ہی جلا کرتی ہوں
سایہ ملتا نہیں رستے میں کہیں بھی مجھ کو
کیا بتاؤں میں مقدر کے جھمیلے تجھ کو
میں نے چاہا کہ مرا درد سمجھ لے تُو بھی
دو گھڑی میں بھی ذرا چین سے جی لوں جاناں!
وقت کی گرد سے ملبوس اٹا ہے میرا
آ کہ اس گرد کو اب مل کے جھٹک ڈالیں ہم
شدتِ گردشِ حالات کو اب ٹالیں ہم
تپتے صحرا سے جو منزل نے پکارا مجھ کو
لڑکھڑاتی ہوئی منزل کی طرف چل نکلی

33

دکھ اٹھاتی ہوئی منزل کے قریب جا پہنچی
آرزو تھی کہ تو ہی میرا سہارا بن جائے
میری امید کی کشتی کا کنارا بن جائے
تُو نے پھیلایا ہوا ہاتھ جھٹک ڈالا ہے
واسطہ کوئی نہ ہو جیسے کوئی کام نہ ہو
تجھ سے وابستہ کبھی جیسے مرا نام نہ ہو
جانے کیوں پھر بھی تجھے ڈھونڈ رہی ہیں آنکھیں
کیا ہوئے وعدے ترے، کیا ترے اقرار ہوئے
کیا ہوا پیار ترا اب وہ محبت ہے کہاں
ہے وہ اخلاص کہاں اور مروّت ہے کہاں
میرے خوابوں ہی میں آ میرے خیالوں ہی میں رہ
میں کسی رنگ سے محسوس تو کر لوں تجھ کو
اپنی ممتا بھری آغوش میں بھر لوں تجھ کو

36

اعصاب شکن موسم میں کہی گئی ایک نظم

یوں تو ہر لمحے ترا ساتھ مری چاہت ہے
تیرا احساس ترا پیار مری جنت ہے
پھر بھی کچھ لمحے ترے بن بھی گذارے میں نے
وقت کا کرب اکیلے بھی سہا ہے مَیں نے
آج جیون کی کڑی دھوپ میں چلتے چلتے
تھک گئے پاؤں مرے آگ میں جلتے جلتے
آبلہ پائی سے آزردہ نہیں ہوں جاناں
تلخیِ دَور سے درماندہ نہیں ہوں جاناں
عزم بھی دل میں ہے اور عزمِ سفر بھی جاناں
وقت کی گرد نے راہوں کو مری ڈھانپا ہے
جانے کیوں روح مری آج تھکی جاتی ہے
راہ جیون کی ہر اک دُھندلی ہوئی جاتی ہے

میں نے جیون کے ہر اک پل متحرک رہ کر
بڑھ کے منزل کی ہر اک راہ کو اپنایا ہے
ہو گیا کچا مری روح کا ہر ناگا ہے
میرے اپنے جو مری روح مرا جیون ہیں
آج ڈسنے کے لیے ناگ بنے جاتے ہیں
میرے اعصاب شکنجے میں کسے جاتے ہیں
کیوں نہیں ان کو یہ احساس کہ سارا جیون
صرف اُن ہی کے لیے میں نے بتایا اب تک
صرف اُن ہی کے لیے خود کو تھکایا اب تک
آس کی ڈور بندھی رکھی ہر اک سانس کے ساتھ
پھانس بھی چُبھتی رہی آس کی ہر سانس کے ساتھ
میں بھی انسان ہوں سینے میں دھڑکتا دل ہے!
اپنے ارمانوں کو سینے میں چھپا کر اب تک
اپنے جذبات کو ہر اک سے چھپا کر اب تک
چاہتیں بانٹی ہیں دنیا کو محبت دی ہے
خود ٹھٹھرتی رہی دنیا کو حرارت دی ہے
آج کچھ کرب مرا آؤ ذرا بانٹ ہی لو!

36

اس سے پہلے کہ چھنا کے سے مرا دل ٹوٹے
کرچیاں اس کی بکھر جائیں ترے پاؤں تلے
رکھ تو آہستہ قدم بڑھ کے مجھے تھام بھی لے
میرے ہمراہی! تُو ہمت سے ذرا کام تو لے!

تیری بھرپور محبت جو مری رہبر ہے
اک نیا عزم جگا دے گی مرے جیون میں
اک نئی بزم سجا دے گی مرے جیون میں
آکے دو چار گھڑی پاس مرے بیٹھ بھی جا
ہم سخن بن کے مرا درد ذرا کم کر دے
آگ بھڑکے نہ کہیں لَو ذرا مدھم کر دے

وحشتِ شب

گرمیٔ افکار کی بھٹی قیامت خیز ہے!
سوچ کے جنگل میں اب کے آگ بھی کچھ تیز ہے!
دل مرا ہے وحشتِ شب سے گریزاں آج بھی
یہ ہوائے درد تو شہناز اب مہمیز ہے!

37

خود کلامی

میرے اندر جو شخص رہتا تھا
ساتھ میرے جو کرب سہتا تھا
وہ تو کب کا بچھڑ گیا مجھ سے
ایک دھندلا سا نقش باقی ہے
جو مری یاد کے ہیولے میں
آ کے اکثر مجھے رُلاتا ہے
یاد اپنی مجھے دلاتا ہے
سوچتی ہوں کبھی ہوا ایسا بھی
ساتھ اپنے رہے سدا کوئی
کر نہ پائے اسے جُدا کوئی
چھوڑ دیتا ہے ساتھ سایہ بھی

ڈھلتے سورج کے ساتھ ہی اکثر
خود ہی خود سے سوال کرتی ہوں
خواب اکثر ادھورے رہتے ہیں
کس کو ملتی ہیں ان کی تعبیریں
نفس کو احتساب دیتی ہوں
خود ہی خود کو جواب دیتی ہوں
وہ جو بچھڑا تھا شخص مجھ سے تب
ہم نفس وہ نہیں ہے میرا اب
اب تو دنیا کے سنگ رہتی ہوں
غم زمانے کے ہنس کے سہتی ہوں
جو بھی کہتی ہوں، خود سے کہتی ہوں
کوئی حسرت نہ کوئی ارماں ہے
آج کچھ اس طرح سے جیتی ہوں

وارثِ زنداں

کچھ وحشی تمنّاؤں کے مجرم ہیں یہاں بھی
خمیازۂ توہینِ جہاں ملتا ہے جن کو
میرا بھی لکھا نام تھا اس میں سرِ محضر
اس گردشِ دوراں کو بتا کہ مری بیڑی
اک گوشۂ تاریک میں پھینکا گیا مجھ کو
اب زیست کے ساتھی ہیں خموشی، در و دیوار
خوش آگئی ہے وحشتِ تنہائیِ خوں بار
اس کنجِ قفس کو تو نہ چھینو کوئی مجھ سے
میں وارثِ زنداں ہوں مجھے کوئی تو حق دو



شہناز مزمّل

شہناز مزمّل نے زندگی اور کتاب دونوں کے ساتھ اپنا رشتہ قائم رکھا ہے۔ اس کا ایک عملی ثبوت ان کی شاعری بھی ہے جو ہمارے ارد گرد پھیلے ہوئے مسائل سے بہت گہرا تعلق رکھتی ہے۔ جذباتی سطح پر یہ شاعری معصوم اور خاموش جذبوں کا اظہار ہے۔ انھوں نے دھیمے دھیمے لفظوں میں اپنے دل کی بات کہی ہے اور کبھی بلند آہنگ دعوے نہیں کیے۔ یہی مدھم مدھم لہجہ ان کا اسلوبِ خاص ہے۔

شہزاد احمد

شاعری نامعلوم کا سفر ہے اور نامعلوم ہمارے تمام تصوّرات سے بڑا ہے۔ اس کائنات کے ہر ذرّے میں نامعلوم کا اِک جہان آباد ہے۔ اِس گُم شدہ جہان کی تلاش ہی شاعری ہے۔ شعر لکھنے کی جستجو شاعر میں اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب اُسے منظروں میں چھُپے پس منظروں اور پیش منظروں کا ادراک ہو جاتا ہے۔ محترمہ **شہناز مزمّل** کی شاعری پڑھتے ہوئے مجھے اس بات کا شدّت سے احساس ہُوا کہ جیسے مَیں دشتِ حیرت میں سفر کر رہا ہُوں اور اس کے ہر قدم پر اِک نئی حقیقت میری منتظر ہے یا پھر یُوں ہے کہ پُرانی حقیقتیں اپنے چہرے اور پیرہن بدل بدل کر میرے سامنے آ رہی ہیں۔ ہمارے عہد میں خاص طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ جب شاعر کو اِس قسم کی صُورتِ حال کا سامنا ہو تو اس کے لیے شاعری کی مروجہ DICTION بالعموم اور اس کی FORM بالخصوص OUT OF DATE ہو جاتی ہے۔ اِس حوالے سے جب مَیں محترمہ **شہناز مزمّل** کی شاعری دیکھتا ہُوں تو مجھے خوشگوار حیرت ہوتی ہے۔ اُن کے ہاں کلاسیکل غزل کا پُورا رچاؤ موجُود ہے۔ پُرانے الفاظ کے CREATIVE استعمال کے ساتھ ساتھ انھوں نے کم مستعمل الفاظ کو بھی خوبصورتی سے POETIFY کیا ہے جو ان کی بہت بڑی کامیابی ہے۔

فیصل حنیف